جناب پروفیسر محمد سلیمان اظہر
لیکچرار اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

سامی اقوام کا وطن اور زبانیں

سامیوں کا مسکن اول کون سا تھا؟ اس معاملے میں بہت سے نظریات اصحاب رائے نے پیش کئے، جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

۱۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا اصل وطن آرمینیہ اور کردستان وغیرہ کا علاقہ ہے اور یہیں سے وہ ایشیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئے۔ یہ قیاس کتاب مقدس میں بیان کردہ نوحؑ کے سفینے کے قصہ پر مبنی ہے۔ اس نظریہ کے حامل علماء کا کہنا ہے کہ نوحؑ کی کشتی طوفان تھم جانے کے بعد اس علاقے میں آ گئی تھی۔ یہ ہی علاقہ بعد میں اس قدیم ترین خاندان کی جائے سکونت بن گیا جس سے اقوام السامیہ کی بنیاد پڑی۔ لیکن اس میں تاریخی ثبوت کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ نولڈیکے اس تھیوری کی تردید کرتے ہیں اور اب اس کو کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔

۲۔ بعض لوگوں نے افریقہ کو سامی گروہ کا مسکنِ اول قرار دیا ہے جس سے سام کے بھائی حام کی نسل تعلق رکھتی ہے۔ نولڈیکے بھی اس نظریہ کا حامی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ سامی اور افریقی زبانوں میں ایک خاص مشابہت ہے۔ مثلاً ان کے ہندسے اور الفاظ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اس بنا پر اس کا خیال ہے کہ سامیوں کا اول مسکن افریقہ تھا۔ اس کے علاوہ بنو سام اور حام میں بہت کچھ طبعی مماثلت اور مشابہت بھی پائی جاتی ہے لیکن تاریخی طور پر اس کی کوئی قابلِ اعتبار شہادت نہیں ملتی۔ اس کی مخالف دلیل یہ بھی ہے کہ آخر یہ کیوں فرض کر لیا گیا کہ چونکہ حام کی اولاد افریقہ میں آباد تھی اس لئے بنو سام بھی وہیں سے شروع ہو گئے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ بنو سام کے ساتھ اولادِ حام بھی ابتدا میں خطہ عرب میں ابتداً تھی اور آخر کار گردشِ روزگار سے افریقہ میں جا بسی ہو۔

۳۔ اٹلی کے مشہور مستشرق GUIDI نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سامی قوموں کا اصل وطن دریائے فرات کا زیریں علاقہ ہے۔ اس نے اپنے نظریئے کے ثبوت میں یہ دلیل دی ہے کہ جغرافیائی، نباتاتی،

اور جسمانی حالات و واقعات مختلف سامی زبانوں میں تقریباً ایک جیسے بیان کئے گئے ہیں اور جن جن خطوں میں مختلف سامی زبانیں استعمال کی جاتی ہیں، ان کے طبعی اور قدرتی حالات میں بھی کافی مشابہت موجود ہے۔ ان حالات کا مشاہدہ دجلہ اور فرات میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ دلیل ایک عمدہ لسانی تجزیئے پر مبنی نظر آتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سامی نسل کے لوگ پہلے زرعی زندگی سے بھی دوچار رہے۔ پھر بدوی طرزِ معاشرت سے بھی انہیں گذرنا پڑا۔ اسی اطالوی نے سامی زبانوں کے الفاظ کی مشابہت سے جو تصویر کھینچی ہے وہ سرزمین عرب کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ کیونکہ یہ علاقہ بھی آغاز میں کافی سرسبز رہا ہے۔

۴۔ سامی زبانوں کے مسکن اول کے بارے میں اہم ترین نظریہ وہ ہے جس کی تائید و حمایت بروکلمن وغیرہ قابلِ قدر فضلا نے کی ہے۔ یعنی یہ کہ بنو سام کا مسکن اول عرب تھا۔ تاریخ کے گہرے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض قومیں وقتاً فوقتاً جنوبی عرب سے ہجرت کر کے قریب کے قابلِ کاشت علاقوں میں جاتی رہی ہیں۔ جہاں بعد میں انہوں نے کئی طاقتور حکومتوں کی بنیاد بھی ڈالی۔ اس مسئلے کی تائید یوں بھی ہوتی ہے:

۱۔ عربوں میں امم السامیہ کی لسانی خصوصیات، جسمانی ساخت اور اجتماعی معاشرتی زندگی کے تمام پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے کہ انہوں نے سب خصوصیات کو اپنے اندر سمو رکھا تھا۔

۲۔ عراقی اور آرامی ادب اب بھی اسی چیز کی جیتی جاگتی تصویر ہے کہ سامی بدوی النسل تھے۔ مثلاً ان کی تشبیہات اور ان کا اندازِ بیان بدویانہ زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور جنوب مغربی ایشیا میں عرب ہی ایک ملک ہے جہاں بدوؤں کا طرزِ معاشرت اپنے جوبن پر رہا ہے۔ اسی لئے عرب کو سامیوں کا اصل وطن قرار دینا زیادہ قرینِ قیاس ہوگا۔

۳۔ سرزمینِ عرب کا اکثر حصہ صحراؤں پر مشتمل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحرا بڑھتی ہوئی آبادی کے کفیل نہ ہو سکے اور یہاں سے لوگوں نے ہجرت کرنا شروع کر دی۔ کیونکہ عرب کے مشرق، مغرب اور جنوب تینوں اطراف سمندر ہے۔ یہ لوگ یقیناً شمال ہی کی طرف بڑھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ بابل، شام اور فلسطین وغیرہ میں بسنے والی قومیں کچھ اسی طرح نقل مکانی کر کے وہاں آباد ہو گئیں۔ ۵۰۰۰ سے ۲۰۰۰ ق م کے درمیان یہودی شام اور فلسطین میں آباد ہوئے اور آرمینی شمال کی جانب چلے گئے۔ ۵۰۰ ق م میں نبطی لوگ بھی صنعار کے شمالی مشرق میں جا بسے۔ مستشرق ڈاکٹر ڈی ساسی نے بھی عرب وسطیٰ کو سامی قوموں کا مسکن قرار دیا ہے اور پروفیسر راجرس (ROGERS) کی تحقیقات بھی اسی نتیجہ کی حامی ہیں۔ انہوں نے بھی سرزمینِ عرب کو بنو سام کا اصلی وطن قرار دیا ہے)

ان تمام محققین کی بات پر یقین کرتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ سامی قوموں کا اصلی وطن زیادہ قرینِ قیاس عرب

ہی ہے۔

سامی زبانیں:

علم اللغت یا علم اللسان (PHILOLOGY) اس علم کا نام ہے جس میں زبانوں کی تاریخ، ان کی نشوونما اور ارتقا پر بحث کی جاتی ہے۔ علمائے لسانیات نے اقوامِ عالم کو زبان کی تشبیہ کے اعتبار سے تین خاندانوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ آریائی (ARYAN): جس میں پاک و ہند، ایران، اور یورپ کی زبانیں شامل ہیں۔

۲۔ منگولی یا تورانی (MONGOLIAN): جس میں ترکستان، چین، منگولیا کے خطوں کی زبانیں شامل ہیں۔

۳۔ سامی (SEMITIC): ان میں عربی، آرامی، عبرانی، کلدانی اور سریانی وغیرہ شامل ہیں۔

سامی زبانوں سے مراد ان قوموں کی زبانیں ہیں جو جنوب مغربی ایشیا میں آرمینیہ سے لے کر بحرِ عرب تک اور خلیج فارس سے لے کر بحرِ احمر تک آباد ہیں۔ البتہ سامیہ کی اصطلاح سب سے پہلے جرمن پروفیسر شلوزر (SCHLOZER) نے ۱۷۸۱ء میں وضع کی تھی۔ حضرت نوحؑ کے تین بیٹے تھے: سام، حام، یافث۔ کتاب پیدائش کے مطابق ان زبانوں کے بولنے والی قومیں سام کی اولاد سے تعلق رکھتی تھیں اور یہیں سے سامی کی اصطلاح بنی۔ امم سامیہ میں وہ تمام قبائل اور قومیں شامل ہیں جو گزشتہ کسی بھی زمانے میں کوئی سامی زبان بولتے رہے اور ان کو خارج کرنا ہوگا جنہوں نے باوجود قربت سامی اقوام کے کوئی زبان استعمال نہ کی۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ سامی زبانوں کا منبع ایک ہی ہے۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، سام کی اولاد مختلف اطراف و جوانب میں پھیلتی چلی گئی اور اس کی مختلف شاخیں بنتی چلی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لب و لہجہ بدلنے لگے اور بالآخر فیصلہ و مقام کی خصوصیت کے لحاظ سے سامی زبانوں کی کئی قسمیں ہو گئیں اور پھر جغرافیائی اعتبار سے ان کے مختلف نام رکھے گئے۔ مثلاً قدیم سوریا یعنی شام کی زبانوں کو سریانی کا نام دیا گیا۔ عابر کی زبان عبرانی، آرام کی زبان آرامی اور عرب میں جو زبان استعمال ہوتی تھی اس کو عربی کا نام دیا گیا۔

السنہ سامیہ کی تقسیم:

جغرافیائی نقطۂ نظر سے ان زبانوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، شرقی اور غربی۔

شرقی میں دو زبانیں شامل ہیں۔ ایک آشوری، دوسری بابلی۔ بابلی زبان بابل میں بولی جاتی تھی جو کہ عراق کے موصل کا بالائی علاقہ ہے۔

سامی زبانوں کے زمانے اور ممالک:

السنہ سامیہ چند مختلف زبانوں کے مجموعہ کا نام ہے جس میں مندرجہ ذیل زبانیں شامل ہیں:

۱ - بابلی :

یہ زبان تمام امم سامیہ میں سے قدیم ترین شمار کی جاتی ہے - یہ انداز اً ۳۰۰۰ سے ۵۰۰ ق-م تک عراق اور موصل کے بالائی علاقے میں بولی جاتی تھی جو اس زمانے میں بابل کے نام سے مشہور تھا -

۲ - عبرانی :

حضرت عیسٰی سے ۲ ہزار سال پہلے بنو عابر نے ابراہیم کی زیر قیادت شام سے کنعان کی طرف ہجرت کی - یہ دجلہ اور فرات کے درمیان ایک جگہ تھی جسے مؤرخین الجزیرہ کہتے ہیں - کیونکہ وہ دریا پار سے آئے تھے - اسی لئے عبرانی کہلائے - کنعان میں جب قحط پڑا تو یہ مصر منتقل ہو گئے اور آخر کار موسٰیؑ کی قیادت میں فرعون کی غلامی سے نکل کر سینا میں آئے - یہ یعقوبؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئے سلیمانؑ کے عہد میں عبرانی، مغربی اور جنوبی اسرائیلی ریاستوں میں تقسیم ہو گئے - عبرانی زبان انہی عبرانی لوگوں کی زبان کو کہتے ہیں - اسی زبان کے پرانے کتبوں کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۵۰۰ ق-م سے بنو عابر کی زبان تھی - ہم تک عبرانی زبان پرانے عہدنامہ کے ذریعہ پہنچی - یہ کتاب عبرانی لٹریچر کا شاہکار ہے، گو پرانا تلفظ مکمل طور پر ہم تک نہیں پہنچ سکا -

۷۲۲ ق-م اسرائیلی سلطنت کو شامیوں نے تباہ کر دیا - ۵۸۶ ق-م میں بخت نصر نے یہودی سلطنت کا مکمل خاتمہ کر دیا اور انہیں اپنے ساتھ بابل لے گیا - ۵۸۶ تک عبرانی یہود کی عام زبان تھی - لیکن بخت نصر کے تحت بابل کی اسیری کے زمانے میں عبرانی یہود کی معاشرتی زندگی سے کافی حد تک دور ہو کر رہ گئی - اور اس کی جگہ آرامی زبان نے لے لی - جس کا ان دنوں بابل میں دور دورہ تھا - جب ایرانیوں نے بابلیوں کی بساط الٹ دی تو انہوں نے یہود کو واپس فلسطین جانے کی اجازت دے دی اور انہوں نے یروشلم دوبارہ تعمیر کیا - لیکن جب ۷۰ء میں اس شہر کو رومیوں نے تباہ کر دیا اور یہودی نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئے تو ان کی ایک جماعت عرب میں آباد ہو گئی - نبی اکرم صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مسلمانوں نے قوت پکڑی تو یہود کو مسلمانوں سے میل جول بڑھانا پڑا - جس کی وجہ سے عربی ان کی عام بول چال کی زبان بن گئی اور عبرانی صرف مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لئے رہ گئی - اس دوران عربی نے سیاسی اور سماجی تسلط کی وجہ سے اس پر کافی اثر ڈالا اور اس کے حروفِ علت میں بھی اضافہ کیا تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو - خود عربی نے بھی عبرانی کے بہت سے الفاظ کو اپنایا، خاص طور پر مذہبی اصطلاحات کو !

۳ - آرامی :

یہ ۸۰۰ ق-م سے اولادِ ارم کے ہاں مستعمل تھی - آرامی ارم سے مشتق ہے - یہ زبان شام اور

میسوپوٹیمیا (MESOPOTAMIA) میں مستعمل تھی اور آرامی قوم آہستہ آہستہ اپنے وطن سے نکل کر فلسطین میں پھیل گئی۔ اور ساتھ ہی اپنی زبان کو بھی لیتی گئی۔ ان لوگوں نے آرامی کو عوامی زبان کے طور پر رواج دیا اس وقت عبرانی روزمرہ کے استعمال سے دور ہوتی جا رہی تھی اور عام لوگ عبرانی کو بھولتے جا رہے تھے۔ چنانچہ آرامی نے عبرانی کی جگہ لے لی اور تورات کو بھی اسی زبان میں منتقل کر دیا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں فلسطین میں بولی جانے والی زبان آرامی ہی کی ایک شاخ تھی۔ اس وقت عبرانی یہود علماء کی صرف کتابی زبان تھی اور شام میں اس زمانہ میں جو زبان بولی جاتی تھی اسے سریانی کہتے تھے۔

۴۔ سریانی:

یہ زبان آرامی ہی کی ایک شاخ تھی۔ اس زبان کو ابتدائی دور عیسوی میں بہت اہمیت حاصل تھی کیونکہ عیسائی علماء نے کثیر مقدار میں مذہبی لٹریچر جمع کر رکھا تھا۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے پیش نظر اور زیر اثر سریانی اور آرامی زبانوں نے مکمل طور پر اپنی جگہ عربی زبان کے لئے خالی کر دی۔ لیکن عربی نے بہت سے آرامی الفاظ کو اپنے وسیع دامن میں لے لیا۔

۵۔ جنوبی عربی:

باعتبار کتاب یہ ۸۰۰ ق۔م سے یمن میں بولی جاتی تھی اور حجاز اور دوسرے عرب علاقوں کی زبان سے قدرے مختلف تھی۔ یمن، حضرموت، سبا، سب کی زبان جنوبی عربی ہی رہی۔

۶۔ حبشی:

۳۵۰ء سے حبشہ کی زبان رہی ہے۔ حبشہ کا قدیم نام ابی سینیا ——— ABYSSINIA ——— ہے۔

۷۔ فینیقی:

۹۰۰ ق۔م سے موجودہ لبنانی خطے کی زبان رہی ہے۔

۸۔ عربی:

اس زبان کا جو اول سرمایہ ہم تک پہنچا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قدیم ترین حصہ ۵۰۰ء سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کا معیار اتنا بلند، شستہ اور پاکیزہ ہے کہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان غیر متعین مدت سے وہاں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

سامی زبانوں کی اصل:

سامی زبانیں تمام کی تمام ایک ہی اصل کی فروعات اور ایک ہی درخت کی پھیلی ہوئی شاخیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ایک قدیم مشترک سامی زبان موجود تھی جو ان تمام زبانوں کی جڑ

یا ماں کہلانے کی حقدار ہے۔ اب اس اصل یا جڑ کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ کیونکہ سامی اقوام کو اپنے مراکز سے جدا ہوئے مدتیں گذر چکی ہیں۔ ان کے لب ولہجہ میں تغیر رونما ہو چکا ہے۔ ان کی زبانیں بھی انقلاب و ارتقا کے مختلف مراحل سے روشناس ہوتی رہی ہیں۔ گو ان میں بعض اجزا اب تک مشترک ہیں لیکن پھر بھی یہ بتانا کہ ان کی ماں کون سی ہے، نہایت ہی مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ انکشافات سے کچھ پتہ چل سکے بہرحال اس وقت تو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ان کی اصل کون ہے۔ بعض لوگوں نے عربی کو السنۂ سامیہ کی ماں قرار دیا ہے اور بعض نے عبرانی کو۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں نظریئے حقیقت سے بعید ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام زبانیں آپس میں بہنوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ جو ایک قدیم ترین سامی زبان کی اولاد ہیں۔ اور محققین کے نزدیک عربی ان کی سب سے بڑی بہن ہے۔ یعنی عربی زبان اصل کے قریب تر ہے اور زبان بابلی قدیمہ کو ان کی ماں قرار دیا جاتا ہے جو عربی کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ اس میں کئی الفاظ ایسے ہیں جو عربی میں جوں کے توں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن سریانی اور عبرانی وغیرہ میں جا کر تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ قواعد میں بھی عربی اور بابلی میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے۔ حرکاتِ اعرابی دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔ حالانکہ دوسری سامی زبانوں میں ان کا وجود نہیں ہے۔ اعراب کے علاوہ بابلی زبان میں تنوین بھی پائی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بابلی میں تنوین م ہے اور عربی میں نون۔ اور یہ کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں حروف آپس میں ملتے ہیں۔ علامات جمع "واؤ" اور "نون" دونوں میں ایک ہیں۔ ان تمام حقائق سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ عربی زبان بہرحال اس سامی قدیم زبان سے قریب ہے جو تمام السنۂ سامیہ کی ماں تھی اور جس سے مختلف زبانیں پھوٹتی رہیں۔ گو بذاتِ خود عربی کو سامی زبانوں کی قدیم ترین شکل نہیں کہا جا سکتا۔ مگر وہ قدیم ترین سامی زبانوں کی نمائندگی کیلئے متقدم ضرور ہے۔ عرب زمانہ قبل از اسلام تک فطرۃً تنہا اور الگ تھلگ رہا ہے۔ اس لئے اس خلوت نشینی نے اس کی زبان کو غیر سامی اثرات سے محفوظ رکھا۔ کیونکہ عرب پر کسی بھی بیرونی حکومت کا سیاسی تسلط نہیں رہا۔ جو عام طور پر زبان و آداب میں خرابی کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے بھی یہاں کی زبان میں کوئی قابلِ ذکر انقلاب نہ آیا۔ اگرچہ گردشِ ایام کے ساتھ اس زبان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں مگر وہ ان زبردست تبدیلیوں سے محفوظ رہی ہے جو اس کی بستیوں کو اجنبیوں سے تعلقات قائم کرنے کی وجہ سے قبول کرنی پڑتیں۔

السنۂ سامیہ کے مشترک خواص:

السنۂ سامیہ میں ایک دوسرے کے ساتھ بہت سی مشابہت اور مناسبت موجود ہے۔ اس کی طرف علمائے عرب سعودی عرب وغیرہ نے اشارہ بھی کیا تھا۔ خصوصاً عربی اور عبرانی زبانیں آپس میں بہت قریب ہیں۔

جب یورپ کے علماء نے، جو مذہبًا عیسائی ہیں، حبشہ کی مذہبی زبانوں کا مطالعہ کیا تو انہیں حبشی اور عربی میں بھی مماثلت نظر آئی۔ سترھویں صدی کے بہت سے علماء نے اس کی تائید کی ہے کہ سامی زبانوں میں باہمی ربط اور تعلق ہے۔ انیسویں صدی میں قدیم بابل کی زبان کے کتبے ملنے سے ان زبانوں کے خاندان میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا۔ اسے شامی بابلی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح آرامی اور عربی میں بھی قدرے اشتراک پایا جاتا ہے۔ فینیقی اور جنوبی عربی زبانوں کے کتبات منظر شہود پر آنے سے السنۂ سامیہ کے سمجھنے اور اصل معلوم کرنے میں کافی مدد ملی ہے۔ گذشتہ ایک صدی کے عرصہ میں ان زبانوں کی صرف ونحو کے جداگانہ مطالعہ کے ذریعہ بھی ان کے باہمی ربط کی نقاب کشائی ہوئی ہے۔ ذیل میں ان زبانوں کی باہمی مماثلت اور مشابہت کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ تمام سامی زبانوں میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔ عبرانی اور عربی میں ان کی تعداد کثرت سے ملتی ہے اسی طرح بابلی اور عربی میں بھی مشترک الفاظ کا وجود پایا جاتا ہے۔ قدیم بابلی کے بہت سے الفاظ آج تک اپنی اصل شکل کے ساتھ عربی میں موجود ہیں۔ مثلاً عربی میں سر کو "راس" کہتے ہیں، عبرانی میں "رؤس"، عربی میں "عین"، عبرانی میں "عائن"۔ عربی میں "اذن" عبرانی میں "اوذن" وغیرہ۔ اور ضمیریں بھی ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً عربی میں "ھُوَ" ہے تو عبرانی "ھُوَا" اور سریانی میں عربی کی طرح "ھو" ہے۔ اسی طرح عبرانی میں "اَتَّ" سریانی میں "اَنْتِ" اور عربی میں "اَنتَ"!

۲۔ السنۂ سامیہ کی نحو تقریبًا ایک جیسی ہے یا باہم ملتی جلتی ہیں۔ الفاظ کی بناوٹ، جملوں کی ترتیب اور فقروں کی ترتیب اسی بات کی مظہر ہے کہ سب زبانیں ایک خاندان کی شاخیں ہیں۔

۳۔ سامی زبانوں کا ایک بڑا خاصہ مادہ ہے اور یہ خصوصیت ان کو دیگر تمام زبانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ مادے کا مطلب ہے کہ ان کا ہر ہر لفظ ایک اصل رکھتا ہے۔ جو عام طور پر تین حروف پر مشتمل ہوتا ہے۔ انہی تین حروف پر تمام اسماء اور افعال بنتے ہیں اور ہر فعل یا اسم کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ اسی طرح الفاظ کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ مگر سہ حرفی مادہ اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔ ان مادہ سے پیدا ہونے والے افعال و اسماء، جنہیں مشتقات کہتے ہیں، ان میں اعراب کے بدلنے سے تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً ق ب ل ایک سہ حرفی مادہ ہے اس سے قَبِلَ، قُبِلَ، قابل، مقبول وغیرہ الفاظ بنتے ہیں۔ پھر انہی تین حروف میں مزید حروف شامل کرکے اور الفاظ بنتے ہیں۔ اقبال، تقبل، استقبال، مقابلہ، تقابل ــــــ ان مادوں کی تعداد عربی میں ۴، ۵ ہزار کے درمیان بتائی جاتی ہے۔

۴۔ السنۂ سامیہ کی ایک اور اہم خصوصیت ان کی آپس کی مشابہت ہے۔ وہ یہ کہ ان میں فعل اور

اسم کے الگ وزن موجود ہیں۔ انہیں اوزان الاسم اور اوزان الافعال کہا جاتا ہے۔ ہم ان اوزان کی مدد سے آسانی کے ساتھ فعل اور اسم کی مختلف قسمیں وضع کر سکتے ہیں۔

۵۔ ان زبانوں میں ضمیریں بھی تقریباً ہم شکل ہیں اور ان کی گردانیں بھی باقاعدہ موجود ہیں۔

۶۔ سامی زبانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک مرکب الفاظ بنانے کا رواج بہت ہی شاذ ہے۔ اسیرین خاندان سے تعلق رکھنے والی زبانوں میں مرکب الفاظ کا بڑا رواج ہے۔ مثلاً فارسی میں "آتش" اور "کدہ" مل کر "آتشکدہ" بن گیا۔ ہندوستان میں "پانی" اور "چکی" مل کر "پن چکی" ہو گیا لیکن سامی زبانوں میں ایسا نہیں، وہ اس امر کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ (اگرچہ جدید عربی میں ایسا موجود ہے جیسا کہ "آلۃ مکبر الصوت" = "لاؤڈ سپیکر")

۷۔ سامی زبانوں کی خصوصیت ان میں اعراب کا وجود بھی ہے۔ اعراب کی تبدیلی سے معانی میں بہت زیادہ اختلاف ہو جاتا ہے۔ اسم اور فعل دونوں میں اعراب کا لحاظ ضروری ہے۔ مثلاً اَسَدٌ (شیر) اُسُدٌ (بہت سے شیر) قَتَلَ (اس نے قتل کیا) قُتِلَ (وہ قتل کیا گیا) وغیرہ۔

۸۔ سامی زبانوں میں جملوں اور فقروں کو حروفِ عطف سے ملایا جاتا ہے۔ حروفِ عطف میں "و" زیادہ مشہور ہے۔

۹۔ الفاظ کی کثرت اور فعل کے بیشمار اوزان، اعراب کی تبدیلی اور الفاظ کے معانی میں اختلاف نے عربی اور دوسری سامی زبانوں میں بہت سے نئے علوم کا اضافہ کیا ہوا ہے اور ایجاز و اختصار مسجع اور مقفع عبارتیں انہی خصوصیات اور لوازمات کی بدولت عالمِ وجود میں آگئی ہیں۔

ضروری گذارش

حساب کتاب میں سہولت کے پیشِ نظر ادارہ ترجمان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وی۔پی۔پی کی رقم نو روپیہ نوّے پیسے (۹/۹۰) سے بڑھا کر دس روپیہ (۱۰/-) کر دی جائے۔ امید ہے کہ قارئینِ ترجمان صرف دس پیسے کا یہ اضافہ محسوس نہیں فرمائیں گے۔

(مینجر)